(غلام گردش)

لاٹھی!

ہمارے اردگرد سب کچھ کیا ہے۔ یہ اصل ہے یا اصل کی نقل۔ کیا اصل واقعی کسی حیثیت کا حامل ہے۔ کیا واقعی نقل ممکن ہے۔ ممکن اور غیر ممکن میں کیا فرق ہے۔ کوئی تو سمجھائے کوئی تو راستہ دکھائے۔ کوئی تو بتائے کہ یہ دنیا، اس میں موجود محیر العقول تغیر، فنا اور بقاء، رنگ اور خوشبو، انسان اور موت سب کچھ کہاں سے کشید ہوئے ہیں۔ کیا یہ سمجھ آجاتے ہیں۔ کیا واقعی انہیں سمجھنے کی ضرورت ہے بھی کہ نہیں۔ یہ صوفی کون لوگ ہیں۔ کیا یہ عقل اور روحانی گھتیاں سلجھانے والے حکیم ہیں۔ خدا اگر نہیں راستہ دکھا رہا ہے تو پھر ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کیوں مار رہے ہیں۔ صاحب! کوئی راستہ، کوئی پگڈنڈی، کچھ تو ہو۔ راہِ فنا پر چلنے والے لوگ اس قدر نایاب کیوں ہیں۔ خوشی اور غم سے بے نیاز۔ عشق کے شیرے میں ڈوبے ہوئے آم کے ٹکڑے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسکے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ درست ٹھہرا۔ مگر پھر صدا بلند ہوتی ہے کہ کیا گناہ کے راستے پر انسان خود جاتا ہے یا یہ بھی اسی کا اذن ہے۔ اگر سب کچھ وہ کر رہا ہے اور کروا رہا ہے تو پھر ہم کون ہیں۔ یہ جسم، یہ عقل، یہ جہانِ رنگ و بو دراصل کیا ہیں!

تین دہائیاں پہلے، ذاتی اُلجھن کا شکار تھا۔ ویسے اب بھی ہوں پر نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ درمان کے نزدیک ایک گاؤں ہے۔ وہاں باباجی سے ملاقات ہوئی۔ درمان شکرگڑھ سے دس پندرہ کلومیٹر آگے ہے اور باباجی کی رہائش گاہ اس سے بھی چند کلومیٹر آگے۔ معذور تھے۔ کم بولتے تھے۔ بتایا گیا کہ یادِ الٰہی میں غرق رہتے ہیں۔ انتہائی پُرکشش بزرگ۔ مکان پکا تھا اور مکین انتہائی پختہ۔ میرے ساتھ ایک ساتھی تھے جو انکے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ دونوں ادب سے بیٹھ گئے۔ اچانک بزرگ نے حکم دیا کہ قریب آؤ۔ دونوں ہاتھ، اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے۔ کہا، پریشانی دور ہو جائیگی۔ فکر نہ کرو۔ مگر میں نے تو پریشانی کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھ سے خوب باتیں کرنی شروع کر دیں۔ کچھ وقت کے بعد اجازت لینے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی بیٹھے رہو۔ یاد نہیں کہ چائے کیلئے روکا یا کھانے کیلئے۔ شائد چائے کیلئے۔ حد درجہ آسان مگر دقیق باتیں کر رہے تھے۔ ادب کی وجہ سے جواب دینا ناممکن تھا۔ تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ فرمایا۔ اب جاؤ۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ سب خیر ہے۔ شکرگڑھ واپس پہنچا۔ ملک کے باہر سے فون آیا کہ مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں موبائل فون نہیں تھے۔ انٹرنیشنل ایکسچینج کے ذریعے باہر سے فون آتے تھے۔ بہت انتظار کرنا پڑتا تھا۔ حیران رہ گیا کہ یہ سب کچھ کیونکر اور کیسے بہتر ہو گیا۔ اگلے دن، اپنے دوست کو کہا کہ چلیے، باباجی کا شکریہ ادا کرنے جاتے ہیں۔ جواب ملا کہ شکریہ کیلئے ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسکے بعد باباجی سے ملاقات نہ ہو پائی۔ معلوم ہوا کہ وہ تو کسی سے بھی نہیں ملتے۔ کیا وزیر، کیا مشیر، کیا وزیراعظم اور کیا سرمایہ دار۔ ہاں اتنا ضرور پتہ چلا کہ جسکے لیے ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہیں اسکا کام رُکتا نہیں۔ پھر زندگی کی بھیڑ میں سب کچھ بھول گیا۔ اب کچھ کچھ سمجھ آ رہی ہے۔ تو یہ واقعہ ذہن سے نکل کر بالکل سامنے کھڑا ہو چکا ہے۔ یہ باباجی کیوں ایسے تھے۔ یہ سب سے کیوں نہیں ملتے تھے۔ صاحب، کچھ معلوم نہیں۔ بلکہ ادراک ہی نہیں۔ ایک سیانے سے پوچھا تو کہنے لگا، کہ جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یا الٰہی یہ گورکھ دھندا کیا ہے۔ کیوں ہے۔ اس دھاگے کا سرا کس کے پاس ہے۔ اُلجھاؤ اس قدر کیوں

ہے۔

ویسے یہ بابے ہوتے بہت خطرناک ہیں۔غیر محسوس طریقے سے آپکی فہم پر حملہ کرتے ہیں۔سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔مگران سب کا طریقہ الگ الگ ہے۔کوئی وحدت اَل وجود کے استغراق میں ہے۔کوئی وحدت اَل شہود کی راہ کا مسافر ہے۔ہاں،سلطان باہو کے بقول وحدت اَل مقصود کا بھی ایک خفیہ راستہ ہے۔مجھے یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔جتنا غور کرتا ہوں ایک خالص کیفیت میں ڈوبتا چلا جاتا ہوں۔روحانی دلدل جو بالکل نظر نہیں آتی۔پر آپ پر قبضہ کر لیتی ہے۔اسی عالم میں ابوسعید مخزومی کے افکار پر نظر پڑتی ہے۔بغداد میں باب اَل عزج کے نام سے ایک عظیم مدرسہ قائم کرنے والے محترم انسان۔عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اُستاد۔وحدت الوجود کے بانی۔یہ بزرگِ کمال تھے۔صاحبان، کمال۔ابوسعید ایک صوفی بزرگ تو تھے ہی۔مگر سوچنے والے انسان۔پابندِ شریعت۔خدا،انسان اور کائنات کے درمیان ربط ڈھونڈتے ہوئے زندگی گزار ڈالی۔لوگوں کو تفصیل سے بتایا کہ سب کچھ ''وہی'' ہے۔اس سے جدا کسی کی کوئی ہستی نہیں ہے۔سب کچھ عدم وجود ہے۔وجود صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہے رب کائنات کا۔ابوسعید حالتِ استغراق میں کہنے لگے۔''میں نے اپنا خرقہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو عطا کر دیا ہے اور اس نے اپنا جبہ مجھے دے ڈالا ہے۔ہم دونوں ہی کامیاب ہو گئے''۔مگر ذہن میں سوالات کا ایک عجیب سا رنگدار قافلہ ہے۔اگر ہمارا وجود ہی نہیں ہے تو کس بات کا ڈر۔کوئی خوف نہیں۔نہ زندہ رہنے کا شوق اور نہ دنیا سے جانے کا ڈر۔کام تو پھر ہو چکا ہے۔جب پلٹ کر اسی کی ہستی میں شامل ہونا ہے تو پھر تو کمال انجام ہے۔خاتمہ بالخیر۔مگر سوال تو اُبھرتا ہے کہ ہمارے اردگرد ہر رنگ، ہر نسل، ہر طور کے انسان، پرندے، درخت اور نظر نہ آنے والی مخلوق موجود ہے۔یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ وجود کے بغیر ہو۔آخر کہیں نہ کہیں تو انکا وجود ثابت تو ہوگا۔یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر چیز ہی بے وجود ہو۔تیسری آنکھ سے دیکھیے تو سب کچھ نظر آنا بند ہو جاتا ہے۔صرف اسکا وجود رہ جاتا ہے۔ہمہ وقت۔کرسی پر تو صرف وہی بیٹھا ہوا ہے۔جن وانس کی قطاریں لگی ہوئی ہیں جو اسکی ذات میں شامل ہوئی جاتی ہیں۔بات صرف اور صرف گیان کی ہے۔انسان سوچ کا وہ محور ہے جسے جاننا اور پہچاننا حد درجہ ضروری ہے۔کام مگر مشکل ہے۔سفر بھی کافی طویل ہے۔مگر بات درست ہے۔

پھر نظر علاالدولہ سمنانی کی طرف اُٹھتی ہے۔اپنے زمانے کے عظیم صوفی تھے۔وحدت الشہود کے نظریہ کے بانی تھے۔فارس میں مقیم یہ بزرگ صوفیوں ہی کے قافلے کے برگزیدہ مسافر تھے جو انسانی ذہن کو سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔انہی کے فلسفہ سے احمد سرہندی متاثر ہوئے۔جنہوں نے برصغیر میں وحدت الوجود کے فلسفہ کے مقابل متضاد فلسفہ یعنی وحدت الشہود پیش کیا۔ہمارے جیسے طالبعلموں کا انکی مشکل گھتیوں سے کیا تعلق۔یہ سب بزرگ درست تھے۔اپنے اپنے انداز سے سمجھا رہے تھے کہ فکری بہتری کیسے لائی جائے۔ایک ہی سمت میں رواں دواں لوگ۔مگر قافلے ذرا سے مختلف تھے۔مقصد ایک ہی تھا کہ انسان، کائنات اور خدا کے درمیان ربط کو واضح کیا جائے۔مجھے ویسے دونوں ہی دلبستان اپنی طرف کھینچتے ہیں۔دونوں سے متاثر ہوں۔لگتا ہے کہ پنڈولم بن چکا ہوں۔کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف۔مگر ذہن میں بازگشت ہے کہ ہر سمت بھی اجنبی سی ہے اور واقف حال بھی۔سب کچھ درست ہے اور کچھ بھی غلط نہیں۔عجیب سا ذہن ہے۔سوال کرنے سے باز نہیں آتا۔شائد سائنس کی تعلیم نے ہجت در ہجت کرنا سکھا دیا ہے۔ہر سوال یکساں

ہرگز نہیں ہوتا۔کسی بھی کتاب میں جواب نہیں ملتا۔سوائے اللہ کی الہامی کتاب میں ۔پھر رشک آتا ہے ان لوگوں پر، جو اللہ کی آخری کتاب کو حفظ کر لیتے ہیں۔ذہن نشین کرتے ہیں۔اسے بیان کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔مگر میرے جیسے جاہل بھی تو ہیں۔جو ال م پر منجمد ہو چکے ہیں۔یہ تین حروف اتنے رعب و دبدبہ والے ہیں کہ آگے نکلا نہیں جاتا۔مالک کے اپنے الفاظ۔لافانیت اور راز سے شرابور۔کیا بات کر کے سمجھاؤ۔حکم ہے کہ نماز ایسے پڑھو جیسے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔نماز تو سراپا عشق ہے اور اگر خالق دیکھ رہا ہے، یقیناً دیکھ رہا ہے۔تو بتایئے کہ انسان، استغراق میں کیونکر نہ جائے۔وہی الہامی دعائیں اور مالک کے سامنے کھڑے ہونا۔صاحبان! ان ناکارہ لوگوں میں سے ہوں، جو حدِ ادب کے اندر رہتے ہیں۔سوچیے تو سہی۔کہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اور سامنے بھی رب کائنات کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے۔پھر پیچھے کیا رہ گیا۔انسان پگھل جاتا ہے۔یا شائد ایمان کی فولاد میں ڈھل جاتا ہے۔تھوڑے سے وقت کیلئے بھی کائنات کے خالق کے سامنے جانا حد درجہ مشکل ہے۔کبھی نمازِ عشق پڑھ کر تو دیکھیے۔طالبعلم تو مکمل طور پر بے بس ہو چکا ہے۔کسی بھی نکتہ کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔صرف عمل کر کے دیکھیے۔ویسے علم اور عمل کا آپس میں کیا تعلق ہے۔کم علمی، لاعلمی اور جہالت بہتر ہے۔یا روحانی پہیلیاں سلجھانے کی کوشش۔

صوفی تھوڑے عرصے سے خاموش ہے۔آٹھ دس ماہ پہلے بات ہوئی تو کہنے لگا کہ ملاقات کرینگے۔مگر شرط یہ کہ گفتگو نہیں ہوگی۔مکمل خاموشی کی زبان میں بھرپور باتیں ہونگی۔صوفی بھی عجیب آدمی ہے۔بہترین کپڑے پہنتا ہے۔انتہائی صبر اور نظم سے زندگی گزارتا ہے۔اپنا دکھ کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔دنیاوی آلام کو حکمت سے سلجھاتا ہے۔خودداری کی اعلیٰ مثال۔اگر آپ اسکا کوئی کام کرنے کی کوشش کریں تو خاموش ہو جاتا ہے۔جیسے مداخلت پسند نہیں آئی۔دنیاوی کام کسی کو نہیں کہتا۔ہاں! ایک جگہ جا کر ٹوٹ جاتا ہے۔حضرت صاحب کے سامنے عجیب رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔کئی بار دیکھا کہ انکے پیر پکڑے ہوئے ہیں۔حضرت صاحب بھی اسے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔جس میں محبت کا تڑکہ بھی لگا ہوا ہے۔دونوں ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔میرے جیسے غافل کو کھلی کھلی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔تو راز و نیاز کی گھنجلیں کیونکر پتہ چلیں گیں۔حضرت صاحب بھی بھرپور طریقے سے نہ سمجھ آنے والے آدمی ہیں۔ایک ایسا ہیرا جسکے ہزاروں رخ ہیں۔ظاہری بھی اور باطنی بھی۔صوفی کو تو خیر پتہ ہے۔مگر مجھے بالکل اندازہ نہیں۔دونوں گفتگو کیے بغیر بولتے رہتے ہیں۔ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ سمجھاتے رہتے ہیں۔پر عجیب بات ہے۔کہ میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا۔نہ درمان کے بزرگ سے، نہ صوفی سے اور نہ حضرت صاحب سے۔ویسے یہ لوگ لاٹھی کی طرح ہیں۔مرضی ہو تو آپکے ہاتھ میں آجاتے ہیں اور راستہ دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔اگر اَمر نہ ہو تو انسان کے سر پر برسنا شروع کر دیتے ہیں۔عجیب لوگ ہیں۔حد درجہ عجیب!

راؤ منظر حیات